https://telegram.me/ilmokitab

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ

اس کا انداز نظر اپنے زمانہ سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

ہندوستان میں احیاء دین، دعوت و اصلاح اور اسلام کے تحفظ کی جو بھی تاریخ لکھی جائے گی، مولانا محمد علی مونگیریؒ کے ذکر کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہوگی — وہ دل و دماغ کا حسین سنگم اور عقل و معرفت کا خوبصورت امتزاج تھے، قدرت نے ان کو بیک وقت دور اندیشی، فراست و دانائی، بالغ نظری اور بیدار مغزی سے بھی نوازا تھا اور درد و سوز، سیماب وش تڑپ اور دینی غیرت و حمیت سے بھی، سوز و کیف نے کبھی ان کو اپنے ماحول اور واقعی حالات سے غافل نہ کیا اور فراست و دانائی کبھی ان کی رسم درویشی سے آزاد نہ ہوسکی۔

قدرت نے ان کو جس خاندان کی آغوش میں جگہ دی، وہ پہلے ہی سے ارشاد و معرفت میں ممتاز اور مشہور تھا، ان کے جد امجد سید شاہ غوث علیؒ بڑے صاحب دل اور خدا ترس آدمی تھے، جن کا قیام کانپور میں تھا، یہیں ۳ رشعبان ۱۲۶۲ھ م ۲۸ رجولائی ۱۸۴۶ء کو پیدا ہوئے، دو سال کے تھے کہ والد ماجد نے داغ فراق دیا اور دس بارہ سال کی عمر تک دادا کے زیر سایہ پرورش پائی، ابتدائی تعلیم خود دادا جان کے پاس ہوئی، قرآن مجید عم محترم سید ظہور علی صاحب سے پڑھا، فارسی کی تعلیم مولوی عبدالواحد بلگرامی سے حاصل کی، حفظ شروع کیا؛ مگر ناسازی طبع نے موقع نہ دیا اور تکمیل نہ ہوسکی، نحو و صرف کی کتابیں اپنے زمانہ کے مشہور عالم اور مدرس مفتی عنایت احمد کاکوروی سے اور معقولات اور شرح ملا جامی وغیرہ مولانا سید حسین شاہ سے

پڑھی، صحاحِ ستہ کا درس سبقاً سبقاً نہایت اہتمام سے اور بقول ان کے ہدایہ کی طرح صفحہ دو صفحہ کر کے استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے لیا اور یہ ساری تعلیم اپنے گھر کے علاوہ ''مدرسہ فیض عام کانپور'' اور مولانا لطف اللہ صاحب کے علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد مدرسہ جامع مسجد علی گڑھ میں ہوئی، طالب علمی ہی کے زمانہ سے معقولات سے بے رغبتی؛ بلکہ ایک گونہ تنفر اور قرآن وحدیث اور فقہ سے شغف تھا اور حدیث سے تو خصوصی تعلق تھا؛ چنانچہ تعلیم کی تکمیل اور شادی وغیرہ کے بعد پھر دل و دماغ کی تشنہ کامی مشہور محدث مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے پاس لے گئی، وہاں صحاحِ ستہ کے علاوہ مؤطا امام مالک اور مؤطا امام محمد پڑھی، شاگرد کی سعادت اور مستقبل کی ہوشمندی کا اندازہ کر کے مولانا سہارنپوری بھی احترام واکرام سے پیش آتے، وہاں سے حدیث کی اجازت لی، پھر گنج مرادآباد آئے، یہاں حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی نے صحاح ستہ، مؤطا امام مالکؒ اور حصن حصین کی اجازت دی، اس سے پہلے ایک بزرگ مولانا آل محمد محدث پھلواروی، مہاجر مدنی بھی بلا طلب ہی صحیح بخاری کی اجازت دے چکے تھے۔

سہارنپور سے واپس آئے تو کانپور ہی میں تدریس کا مشغلہ شروع کیا، ذکاوت وطباعی اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے دی تھی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی درسی مسائل پر گھنٹوں اور کئی کئی دن بحث رہتی اور آپ کے اساتذہ بھی آپ کی فطانت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے، اب جو درس شروع کیا تو مرجع خاص وعام بن گئے، صبح سے شب تک پورا وقت تدریس میں گذرتا، ابتداءً تو ملاحدہ درس دیتے رہے، پھر مدرسہ فیض عام کے ارباب انتظام کی خواہش اور اصرار پر خود مدرسہ میں مدرس ہو گئے اور ڈھائی تین سال تعلیم دی، پھر صحت کی نامساعدت اور علالت نے ایسا مجبور کیا کہ تدریس سے رشتہ توڑنا پڑا۔

سلامت روی اور تعلق باللہ فطرت میں ودیعت تھا، بچپن ہی سے علماء حق اور بزرگوں کی تلاش تھی، جب بھی کسی مرد صالح بندۂ خدا نے رُخ کیا، آپ استفادہ کے لئے ان کی خدمت

میں حاضر ہوگئے، آغازِ شباب میں کچھ استفادہ حافظ محمد صاحب سے کیا اور اسی وقت سے دل پر عجیب قسم کی واردات طاری ہونے لگیں، پھر ایک صاحب دل بزرگ مولانا کرامت علی قادریؒ سے دس ماہ استفادہ کیا، اس زمانہ میں حضرت شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی کی کانپور میں آمد ورفت رہتی تھی، آپ طالب علمی ہی سے خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، یہاں تک کہ بیعت بھی ہوگئے اور جلد ہی اجازت وخلافت سے سرفراز بھی کئے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر جو بے نفسی، کسر ذات، استغناء، قناعت وتوکل، حلم وانکسار اور صبر ورضا کا جوہر رکھا تھا، وہ خال خال ہی پایا جاتا ہے، سوز وگداز کا عالم یہ تھا کہ بچپن ہی سے حضور ﷺ کی زیارت کو روتے تھے، نعتیہ اشعار سنتے تو کیف واستغراق پیدا ہوجاتا، نماز سے ایسا عشق کہ اگر جماعت چھوٹ گئی تو صدمہ سے گر پڑتے، تہجد کے بھی پابند، دنیا سے بے رغبتی اور مال واسباب سے بے اعتنائی اس درجہ کہ نذر ونیاز قبول نہ کرتے، توکل کا یہ عالم کہ بارہ سال کی عمر میں جد امجد کا انتقال ہوا اور پورے گھر کی ذمہ داری سر پر آ گئی مگر تعلیم نہ ترک کی، پھر نکاح کیا، حالات نے ملازمت پر مجبور کیا؛ مگر اللہ کی رزاقیت کا ایک مضمون پڑھا، دل کا وسوسہ جاتا رہا اور تحصیل علم میں مصروف رہے، استغناء کا یہ حال کہ حیدرآباد اور مختلف رؤساء وامراء کی طرف سے بڑی بڑی تنخواہوں اور جلیل القدر عہدوں کی پیش کش ہوئی، مگر کاخ درویشی کو ترجیح دیا اور اس طرف توجہ تک نہ کی، بزرگوں کا احترام اس قدر کہ ان کی جوتیوں کے پاس جاکر بیٹھتے، حلم وبردباری کی حد یہ کہ اپنے ماتحتوں کے سخت ترین خطوط اور تنقیدات پر بھی قلم پر حرف شکایت نہ آتا — مگر ان کی ذات درویشی کے ساتھ ساتھ سلطانی کا بہترین مظہر تھی، کہ مہمانوں کی کثرت اور منتسبین کا اژدحام ہوتا، مگر ہر ایک کے لئے مناسب قیام وطعام کا انتظام۔

شاہ فضل رحماں گنج مراد آبادی فرماتے تھے کہ یہ بڑے اور غنی آدمی ہیں اور مجھے اس کو اپنا خلیفہ کہنے میں شرم محسوس ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں ایسا اثر رکھا تھا کہ ایک دفعہ ''اللہ'' کہتے اور پورے مجمع پر رقت اور وارفتگی طاری ہوجاتی، کبھی جوش میں ایک دو

فقرے کہتے تو یہ حال ہوتا کہ تمام حاضرین وجد وجذب کی کیفیت میں مبتلا ہوجاتے اور دلوں پر قابو نہیں رہتا، آپ نے جس علاقہ کا رُخ کیا وہاں مردہ دلوں پر زندگی کی ایک باد بہار آگئی، نشہ خواروں نے نشہ سے اور بے نمازیوں نے غفلت سے توبہ کی اور ننگ قوم رشک قوم بن گئے۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس طرح ان کی طرف متوجہ کیا کہ جہاں جاتے، دور دراز سے لوگوں کا ہجوم وارد ہوکر بیعت ہوتا، حضرت گنج مرادآبادی کے بعد تو ان کے تمام مریدین اور منتسبین کا رُخ بھی آپ ہی کی طرف تھا اور مریدین کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی، صوبہ بہار کے علاوہ بنگال وافریقہ اور مختلف علاقوں میں آپ کے مریدین تھے اور ''چین'' کے بھی ایک بڑے عالم آپ سے بیعت تھے، آپ کے خلفاء میں مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگھ پوریؒ اور مولانا عبدالرشید صاحب رانی ساگریؒ کو زیادہ مرجعیت حاصل ہوئی اور فرزند اکبر مولانا لطف اللہ صاحبؒ جانشیں ہوئے۔

تصوف کے سلسلہ میں مروجہ رسوم سے دور تھے، ان کے یہاں طریقت شریعت کی پابند تھی، فرماتے تھے کہ اتباع سنت ہی سب سے بڑی کرامت ہے، لوگ کشف وکرامات دیکھتے ہیں؛ حالاں کہ دیکھنے کی چیز شریعت پر استقامت، اس کی محبت کا فیض اور متعلقین پر اس کے اثرات ہیں، وہ اس کے قائل نہ تھے کہ شریعت کے مختلف احکام میں درجات ومراتب کا فرق باقی نہ رکھا جائے، مستحب کو واجب کا درجہ دے دیا جائے اور اس کے تارک کو تحقیر کی نظر سے دیکھا جائے، مشاہدات وکرامات کو آپ کے یہاں اہمیت حاصل نہ تھی؛ بلکہ قلب میں حب الٰہی پیدا ہوجانا، ماسوی اللہ سے دل کا کٹ جانا اور خدا کی ذات وصفات کا استحضار زیادہ اہم تھا، وہ رسمی ذکر اور اس کی لذت کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے؛ بلکہ تعلق مع اللہ کا حکم دیتے اور فرماتے کہ بہت سے ذاکرین کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، شیخ کا معیار آپ کے پاس یہ تھا کہ شریعت کا پابند اور عبادات ومعاملات میں درست ہو، اس کی صحبت سے خدا یاد آئے اور دنیا کی محبت کم ہو، وہ ایسے تصوف کے قائل نہ تھے کہ دنیا اور اسباب دنیا سے کوئی ربط ہی نہ رہے؛ چنانچہ اپنے ایک

متعلق کو جنھوں نے ذکر وغیرہ کے لئے تجارت چھوڑ رکھی تھی، بہ اصرار کہا کہ تجارت کریں، اسے حضور ﷺ نے ایک مبارک کام قرار دیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر ایک تارک الدنیا ہو کر مسجد میں بیٹھ جائے؛ بلکہ کہتا ہوں کہ اپنی دنیا کی اصلاح کرو اور آخرت کے لئے عمل کرو۔

نقشبندی سلسلہ کے معمول کے مطابق مولانا بھی تصوف کے دقیق اور لطیف مسائل کی تعلیم نہ دیتے تھے، بلکہ ہر آدمی کے حالات اور صلاحیت کے پیش نظر اذکار و اوراد کی تلقین اور تربیت فرماتے تھے، ایک صاحب نے ابن عربیؒ کے ''وحدۃ الوجود'' اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فلسفہ ''وحدۃ الشہود'' کی بابت تحقیق کی، تو آپ نے مثالوں کے ذریعہ تفہیم کی، اور اس قسم کے مسائل میں نہ پڑنے اور ان بحثوں میں نہ اُلجھنے کی بہ تاکید تلقین بھی فرمائی، اسی طرح ''تصور شیخ''، وغیرہ کی تعلیم بھی اپنے شیخ کے طریقہ کے مطابق نہیں دیتے تھے، مروجہ سماع و مزمار کے قائل نہ تھے اور نہ اس پر عامل، مگر تنہائی میں کبھی کسی خوش گلو رفیق سے ساز و آہنگ کے بغیر نعت سنا کرتے تھے اور اس وقت استغراق کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، طبیعت میں ذوق ونفاست تھی، طبیعت سادہ اور بے تکلف تھی، مگر خوش پوش اور خوش وضع تھے اور کمبل اوڑھنے اور موٹا کپڑا پہننے میں ریاکاری کا خوف محسوس کرتے تھے۔

سفر احسان وسلوک کے راہبر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر زمانہ شناسی اور حالات آگہی بھی تھی اور وہ اسلامی حدود میں جدید فکر و مزاج کے حامل بھی تھے، انھوں نے کانپور میں ''انجمن تہذیب'' قائم کی؛ حالاں کہ اس وقت کسی عالم دین کے لئے ثقافتی انجمنوں کا قیام ایک ''عجیب بات'' تھی، — چوں کہ تعلیم کسی معاشرہ کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم میں مناسب تغیر ضروری تھا؛ اس لئے عملاً آپ ہی نے سب سے پہلے اس سمت میں قدم اٹھایا اور علماء کو اس کی دعوت دی۔

ہندوستان میں اس وقت ''درسِ نظامی'' کا غلبہ تھا، اس نصاب میں ایک تو ''منطق وفلسفہ'' کو وافر جگہ دی گئی تھی، دوسرے جو اور فنون کی کتابیں تھیں، ان کا اُسلوب اور طرز تصنیف بھی خالص معقولی رنگ کا تھا، مولانا کو ایسی کتابیں پسند نہ تھیں، ایک تو شروع سے یہی آپ کی طبعی افتاد تھی، پھر حضرت گنج مرادآبادی کو بھی چوں کہ حدیث سے اشتغال کی وجہ سے معقولات سے نفور تھا؛ اس لئے ان کی محبت نے اور بھی تنفر پیدا کر دیا، ان کی خواہش تھی کہ اس طرح کی کتابیں کم سے کم کر دی جائیں اور تاریخ وجغرافیہ، اسرار وحِکم، تجوید، سلوک، تہذیب نفس، فلسفۂ جدیدہ، ہیئت جدیدہ وغیرہ داخل نصاب ہو، علوم دینیہ میں جدید کلام اور فقہ میں مہارت اور وسیع النظری پر بہت زور دیتے تھے۔

عربی ادب میں مقفع ومسجع انشاء اور اشعار پر اکتفا کرنے اور اس پر زور دینے کے روادار نہ تھے؛ بلکہ عربی کی سلیس ورواں ادب کی کتابوں اور اس پر مشق وتمرین اور انشاء کے قائل تھے اور نصاب میں اس کو زیادہ سے زیادہ جگہ دینا چاہتے تھے، وہ مدارس میں انگریزی زبان کی تعلیم اور عصری تعلیم یافتہ حضرات کے لئے دینی تعلیم کے نظم کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے؛ البتہ اس کو ضروری سمجھتے تھے کہ علوم جدیدہ کو اس طرح داخل نصاب کیا جائے کہ علوم اسلامی کی تعلیم میں خلل پیدا نہ ہو، اُردو کے زندہ اور حاضر اُسلوب میں انشاء وخطابت کی مہارت اور تعلم کے بھی حامی تھے اور ندوہ کے متعلقین ومدرسین کو اس سلسلہ میں ہدایات دیتے رہتے تھے۔

علم کلام میں ان کا نقطۂ نظر تھا کہ قدیم علم کلام کے ساتھ کوئی ایسی کتاب بھی پڑھائی جائے، جس سے طلبہ جدید علم کلام، مستشرقین کے شبہات واعتراضات اور اس کے جواب نیز عیسائی مشنریوں کی طرف سے اُٹھنے والے تشکیکی پروپگنڈوں وغیرہ سے پوری طرح آشنا ہو جائیں، ان کا جواب دے سکیں اور ایسے اُسلوب میں دے سکیں، جو جدید ذہن کو مطمئن کرے۔

وہ تعلیم کی طرح مدارس کے نظام اور اُصول تربیت میں بھی ایک انقلابی مگر متوازن

تبدیلی چاہتے تھے، وہ طلبہ کے لئے جسمانی ورزش اور حفظان صحت کے اُصول کی رعایت کو بہت ضروری سمجھتے تھے، اس قدر آزادی اور چھوٹ کے بھی روادار نہ تھے کہ طلبہ غیر مہذب ہوجائیں اور اتنی قید و بند اور دباؤ کے بھی قائل نہ تھے کہ بشاشت وطباعی جاتی رہے، وہ ڈسپلن، پابندی اوقات، صفائی ستھرائی، بول چال میں تہذیب اور مطالعہ وغیرہ پر بہت زور دیتے تھے۔

نصاب تعلیم اور دینی مدارس کے نظام کے سلسلہ میں ان کے نقطۂ نظر کی اہمیت اب سمجھ میں نہیں آسکتی؛ اس لئے کہ آج ہر چہار گوشہ سے اس قسم کی صدائیں اٹھ رہی ہیں اور کل کے اندازے آج کے تجربات بن گئے ہیں، مگر اس وقت یہ آواز نامانوس اور عجوبہ تھی، شدید مخالفت کا سامنا تھا اور مدارس کی قدیم روایات کے خلاف گویا ایک طرح کی جسارت تھی۔

''تعلیم'' کے نصاب اور نظام میں اس تغیر کا منشاء یہ تھا کہ دینی مدارس کے فضلاء کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور جدید انداز فکر اور اُسلوب میں اسلام کا نمائندہ بنایا جاسکے، مگر ایسے کسی نظام کے قیام کے لئے اس بات کی بھی شدید ضرورت تھی کہ جدید وقدیم طبقہ ایک دوسرے سے قریب آئے، ان کی خلیج کم ہو اور ان کے فاصلے سمٹیں، نیز علماء جو جدید مسائل پر غور کرنے کی بجائے اپنی پوری توجہ ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق پر صرف کررہے ہیں اور جن کے قلم کی ساری جولانی اور فکر وخیال کی تمام تر تابانی گڑی ہوئی ہڈیاں اکھیڑنے پر لگی ہوئی ہیں، وہ ان باہمی اختلافات اور نزاعات کو بھول کر وسیع النظری اور فراخدلی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں اور ان مسائل پر غور کریں، جو جدید حالات میں ملت اسلامیہ کو درپیش ہیں اور جن کے کے لئے زمانہ آگہی اور اپنے عہد سے باخبری کے ساتھ ساتھ علوم شریعت کی روح، اسلاف کے طریق کار سے واقفیت اور گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔

انھیں اُمور کو سامنے رکھ کر انھوں نے ۱۳۱۰ھ میں اکابر علماء جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، کی معیت میں ''ندوۃ العلماء'' کی بنیاد رکھی، خود ہی اس کے

محرک تھے اور مشورہ میں وہی اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے، جس کا بنیادی مقصد علماء کی جدید تقاضوں کے مطابق تربیت اور ان کے درمیان اتفاق واتحاد پیدا کرنا تھا، اہل دانش اور علماء کی جانب سے اس تحریک کی — جو وقت کی آواز اور سب سے بڑی ضرورت تھی — زبردست تائید ہوئی؛ چنانچہ ہر سال مختلف شہروں میں اس کے سالانہ جلسے ہونے لگے، جس میں جدید مسائل پر مقالات پڑھے جاتے اور تقریریں ہوتیں، یہاں تک کہ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ۱۳۱۶ھ م ۱۸۹۸ء میں ندوہ کے تحت ایک ''دارالعلوم'' کی داغ بیل ڈالی گئی، جو اب ایک معروف تاریخی ''جامعہ'' بن چکا ہے۔

جدید وقدیم کے امتزاج کا خیال مولانا نے ابتداء ہی سے رکھا، بہتر اساتذہ کا انتخاب کیا، یہاں تک کہ مولانا شبلیؒ نعمانیؒ جیسے دیدہ ور، بالغ نظر اور عبقری عالم کو لائے اور ان کی درشت مزاجی اور ایک گونہ تندی کے باوجود پورے حلم وانکسار کے ساتھ نباہ کیا اور اس طرح ندوہ کی آغوش سے علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسا عالم پیدا ہوا، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں تنہا ندوہ کے فخر کے لئے کافی ہے — مولانا نے ندوہ کا نصاب بہت متوازن رکھا تھا اور ''زبان ہوش مند'' کے ساتھ علم وتحقیق پر بھی زور دیا تھا، گو ایک عرصہ تک ندوہ کی فضاء میں زبان وادب اور تاریخ وتذکرہ کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہو رہی۔

مولانا کا خاص مزاج یہ تھا کہ وہ ہر اجتماعی کام میں آگے بڑھتے تھے اور اس کی پوری حوصلہ افزائی اور نصرت کرتے تھے، انھوں نے انجمن تہذیب قائم کی اور خود کوئی عہدہ قبول نہ کیا، ندوہ کی بنیاد رکھی اور لوگوں کے اصرار پر نظامت قبول فرمائی، مگر اس سے بھی بارہا استعفیٰ دیا اور بالآخر مستعفی ہو گئے — اسی زمانہ میں مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ نے امارت شرعیہ کی تحریک کی اور اس کے قیام کے لئے ہندوستان گیر سطح پر جدوجہد شروع کی، مگر مسلمانوں کی گروہ بندی کی وجہ سے اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی، مولانا مونگیری اس تحریک میں شروع سے شریک ومعاون رہے۔

امارت کے قیام سے پہلے ابتدائی مرحلہ کے طور پر مولانا سجاد صاحبؒ نے ''انجمن علماء بہار'' کی بنیاد رکھی اور بہار شریف میں ۱۳۳۶ھ میں اس کا پہلا اجلاس ہوا، اس اجلاس میں مولانا مونگیریؒ کے نمائندہ کی حیثیت سے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے شرکت فرمائی، پھر جب ۱۳۲۱ھ میں امارت شرعیہ کے باضابطہ قیام کے لئے مولانا سجاد صاحب نے مختلف علماء کے نام خطوط لکھے، تو مولانا مونگیریؒ نے پوری گرم جوشی سے اس کا استقبال فرمایا اور اجلاسِ انتخاب میں اپنا نمائندہ بھیجنے کا وعدہ کیا۔

اس وقت بحیثیت امیر دو بزرگوں پر نظر جاتی تھی، ایک: مولانا مونگیریؒ، دوسرے: مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی، اتفاق یہ کہ امیر کے لئے مولانا مونگیریؒ نے مولانا پھلواروی کے نام کی اور مولانا پھلواروی نے مولانا مونگیریؒ کے نام کی تائید فرمائی، اس طرح بالاتفاق مولانا پھلواروی پہلے امیر منتخب ہوئے، بعد میں جب بعض شرپسندوں نے مخالفت کی تو مولانا مونگیریؒ نے پوری قوت اور خلوص کے ساتھ امیر شریعت اول کی تائید کی اور لوگوں کو امارت سے تعاون کرنے کی تلقین کی۔

ہندوستان میں جونہی انگریزوں نے سیاسی اعتبار سے اپنے قدم جمالئے، انھوں نے اپنے فکری اور مذہبی تسلط کی جدو جہد بھی شروع کردی اور بڑے پیمانے پر عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوگئی، اس فتنہ کے مقابلہ میں سرفہرست مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تھے، جنھوں نے ہند سے لے کر حجاز و ترکی تک عیسائیت اور مشہور پادری فنڈر کا تعاقب کیا، مگر ان کے بعد یہ میدان بڑی حد تک خالی رہ گیا، عام علماء کو اس طرف توجہ نہ تھی اور عیسائیت تھی کہ ہر جگہ اپنا قدم مضبوط کرتی چلی جارہی تھی؛ چنانچہ مولانا کیرانویؒ کے بعد جس شخصیت نے اس محاذ پر سب سے گرانقدر خدمت انجام دی، وہ مولانا مونگیریؒ ہی تھے۔

وہ اس کام کے لئے خود بھی اٹھے، دوسرے اہل علم وقلم کو بھی اٹھایا اور عیسائیوں کی چابک دستی علماء کے سامنے رکھ کر ان کو جھنجھوڑا، ۱۲۸۹ھ میں انھوں نے کانپور سے باضابطہ رد

عیسائیت ہی کے لئے ''منشور محمدی'' نامی اخبار جاری کیا، یہ اخبار چار پانچ سال تک رد عیسائیت کا گرانقدر کام کرتا رہا، منشی صفدر علی (جو جبل پور کا رہنے والا تھا اور ۱۸۶۵ء میں مرتد ہوگیا تھا) کی کتاب ''نیاز نامہ'' ـــــ جس میں شریعت اسلامیہ کو بے ضرورت ثابت کیا گیا تھا ـــــ کا مدلل اور مسکت جواب ''آئینہ اسلام کے'' نام سے حیدرآباد کے دوران قیام ۱۲۹۷ھ میں تصنیف فرمایا۔

پادری عماد الدین امرتسری جو ۱۸۶۶ء میں مرتد ہوگیا تھا، کے ایک مناظرہ کی روداد عیسائیت کی حمایت میں ''نفحہ طنبوری'' کے نام سے شائع ہوئی تھی، مولانا نے اس کے جواب میں ''ترانہ حجازی'' لکھی، جس میں نبوت محمدی ﷺ، عصمت انبیاء، مأخذ قرآن وغیرہ پر بہت نفیس بحثیں کی گئی ہیں، اسی طرح پادری صاحب موصوف کی کتاب ''تعلیقات'' کے جواب میں ''ردتعلیقات'' اور ''دفع تعلیقات'' تصنیف فرمائی، اس میں اناجیل کی تحریفات پر مدلل روشنی ڈالی گئی ہے ـــــ ان کے علاوہ قرآن مجید کے الہامی ہونے پر ''سواطع البرہان'' اور عیسائی عقائد کے ابطال پر ''براہین قاطعہ'' تصنیف فرمائی۔

''ردعیسائیت'' کے موضوع پر مولانا کا سب سے براکارنامہ ''پیغام محمدی ﷺ'' ہے ـــــ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے، جس میں بائبل کی تحریفات، تثلیث و کفارہ کے عقائد کا بطلان، قرآن مجید کی حقانیت اور شرع اسلامی اور شرع مسیحی کے تقابلی جائزہ پر مفصل اور مدلل بحث ہے اور جابجا خود عیسائی علماء کا اعتراف بھی نقل کیا گیا ہے، عیسائی پادریوں سے اس کے جواب کا مطالبہ بھی کیا گیا، مگر کسی کو قلم اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

علماء اسلام کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ جب ابطال باطل کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تو بڑے بڑے صنادید کی زبانیں گنگ ہوکر رہ گئیں، خود ہندوستان میں شاہ اسماعیل شہید، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے نام سے بڑے بڑے پادری بھاگتے تھے اور مناظرہ کے لئے تیار نہ ہوتے تھے، یہی معاملہ مولانا مونگیریؒ کے ساتھ ہوا، مولانا کیرانویؒ کے دور میں جیسے پادری فنڈر طاقتور تھا اور وہ مولانا کے نام سے منھ چھپائے پھرتا تھا، اسی طرح

مولانا مونگیری کے زمانہ میں پادری عماد الدین اور پادری صفدر علی کا شہرہ تھا، مگر اس کا حال یہ تھا کہ مولانا مونگیری کے نام سے بھاگتا تھا اور مناظرہ کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔

مولانا مونگیریؒ کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کا لب و لہجہ اور اُسلوب تحریر مناظرانہ اور مخاصمانہ نہیں تھا، وہ سنجیدہ، متین اور مؤثر لب ولہجہ میں مسکت اور مدلل تنقید کرتے تھے، زبان بھی عام فہم اور سہل تھی، نیز پھر عیسائیت، اس کی تاریخ، بائبل کی تفاسیر، علماء عیسائیت کے اقوال و آراء، ان کے فرقے، یہاں تک کہ بائبل کی شخصیات پر بھی ان کا گہرا اور وسیع مطالعہ تھا اور کوئی عیسائی مصنف ان کو دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ''قادیانیت'' کی سرکوبی ہے، بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ: وہ ان چار افراد میں سے ایک تھے، جنھوں نے قادیانیت کی تردید اور مسلمانوں کو اس فتنۂ کبریٰ سے محفوظ رکھنے میں پیش پیش رہے، بھاگلپور (جہاں علماء کی تعداد کم تھی) اور اس کے مضافاتی اضلاع میں اس بات کا شدید اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ مبادا یہ پوری آبادی ارتداد کا شکار نہ ہوجائے اور قادیانیوں کی قوت تشہیر کا عالم یہ تھا کہ ان کے رسائل واخبارات کی تعداد اشاعت ۲۶ ہزار تک تھی، جو اس زمانہ میں غیر معمولی تعداد تھی۔

مولانا اس موقع سے ہمہ تن اس کے مقابلہ کے لئے کمربستہ ہوگئے، اپنے تربیت یافتہ لوگوں کو عام لوگوں کی تنبیہ کے لئے گاؤں گاؤں بھیجا، خطوط لکھے، وقت کا سب سے بڑا فرض اور سب سے بڑا جہاد اسی کو قرار دیا اور فرمایا کہ میرے اس کام میں جو لوگ مدد نہ کریں، میں ان سے ناخوش ہوں، طبعی افتاد کے خلاف اس کام کے لئے چندے بھی کئے، تقریباً سو رسائل ''صحیفۂ رحمانیہ'' کے نام سے شائع کئے، جن میں چالیس آپ کے نام سے اور اکثر دوسروں کے نام سے طبع ہوئے، آپ نے نوافل، اوراد، تہجد اور معمولات وغیرہ کے اوقات کا بڑا حصہ بھی اسی موضوع پر تصنیف وتالیف کے لئے لگا دیا تھا۔

مولانا کی ان کتابوں میں معیار صداقت، معیار المسیح، حقیقۃ المسیح، تنزیہ ربانی، آئینہ

کمالات مرزا، چیلنج محمدیہ، ناشہ حقانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں؛ لیکن اس موضوع پر آپ کی سب سے اہم کتاب تین جلدوں میں 'فیصلہ آسمانی' اور دو جلدوں میں 'شہادت آسمانی' ہے ، اول الذکر مثبت انداز کی ہے، جس میں مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت پر اُصولی اور علمی حیثیت سے عام فہم بحث کی گئی ہے، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے بہ قول یہ کتاب ہر طرح کی استدلالی کمزوری سے پاک اور مفید نوعیت کی حامل ہے، ثانی الذکر مرزا صاحب کے بعض دعووں کی مدلل تردید اور مؤرخانہ تنقید پر مشتمل ہے اور علم و تحقیق کا ایک دُر گراں مایہ ہے۔

ان کتابوں نے ہوا کا رُخ بدل دیا اور لاکھوں آدمی جو مرتد ہو چکے تھے، اسلام میں لوٹ آئے، قادیانی مرتدین جہاں جہاں جاتے، یہ لٹریچر ان کا تعاقب کرتا؛ یہاں تک کہ قادیانیوں نے کتاب کا علمی جواب دینے کے بجائے مولانا کی ذاتی زندگی کے بارے میں غلیظ افترا پردازیاں شروع کر دیں؛ تاکہ لوگوں میں بدظنی پیدا ہو —— مولانا کی یہ کتابیں بہار و بنگال، پنجاب و دکن اور بیرون ہند برما، افریقہ تک پہنچیں اور بہت سی جگہوں سے قادیانیت کی بیخ و بن اکھڑ گئی، مولانا رد قادیانیت کی کتابوں کی تالیف، ان کی اشاعت اور پھیلاؤ میں اس قدر سرگرم تھے کہ فرماتے تھے ''اتنا لکھو، اس قدر طبع کراؤ اور اس قدر تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سو کر اٹھے تو اپنے سرہانے رد قادیانیت کی کتاب پائے''۔

مولانا نے اس مقصد کے لئے خانقاہ میں ایک بڑا مناظرہ بھی کرایا تھا، جس میں مرزا صاحب کی طرف سے ان کے خصوصی نمائندے حکیم نورالدین، سرور شاہ اور روشن علی اور مسلمانوں کی طرف سے علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالوہاب بہاریؒ، مولانا ابراہیم سیالکوٹیؒ اور مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ کے بشمول تقریباً چالیس علماء تھے، مولانا مونگیری نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو تحریری طور پر اپنا نمائندہ بنایا، جن کی طلاقت لسانی اور حاضر جوابی مشہور تھی، اِدھر مناظرہ شروع ہوا، اُدھر مولانا مونگیریؒ سجدہ میں گر پڑے اور اس وقت تک سر نہ اٹھایا جب تک قادیانیوں کی فاش شکست کی اطلاع نہ مل گئی، اللہ کی

قدرت ایسی ہوئی کہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کی ایک ہی تقریر کے بعد قادیانی لاجواب ہو گئے اور راہ فرار اختیار کی۔

مذاہب کے مطالعہ کے علاوہ فقہ پر بھی آپ کی گہری نگاہ تھی، فتاویٰ بھی دیا کرتے تھے، بسا اوقات کانپور سے لکھنو محض کسی مسئلہ کی تحقیق کے لئے سفر فرماتے، مولانا کی فقہی بصیرت اور فقہی مراجع پر وسیع نظر کا اندازہ ان کے ''خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء ہند'' سے لگایا جاسکتا ہے، جو امارت کے موضوع پر ہے، یہ کتاب اس مسئلہ پر نہایت شافی وکافی ہے ـــــ بعض مسائل میں ان کی رائے عام علماء دیوبند سے مختلف تھی، وہ ''مجالس میلاد'' کو حسب مصلحت درست سمجھتے تھے؛ البتہ اس کی بدعات کے روادار نہ تھے، خطبۂ جمعہ کی زبان کے طور پر عربی کو ضروری نہ سمجھتے تھے اور امام ابوحنیفہؒ کے اس قول کے قائل تھے، جس کے مطابق خطبۂ جمعہ غیر عربی میں دیا جاسکتا ہے، اس موضوع پر ان کی محققانہ کتاب ''القول المحکم فی خطابة العجم'' ہے، تراویح کے موضوع پر ان کا رسالہ ''احکام التراویح'' بہت جامع اور نافع ہے۔

فقہ سے ان کی دلچسپی ہی کا نتیجہ تھا کہ ندوہ کے قیام کے بعد اوائل ہی میں انھوں نے ''دارالافتاء'' کے قیام کی تحریک کی اور سے قائم فرمایا، وہ نئے زمانہ اور حالات کے لحاظ سے وسیع النظری اور جدید پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی طرف علماء کو توجہ دلاتے تھے اور شاکی تھے کہ علماء خود حالات زمانہ سے واقف نہیں ہیں۔

---

۸ ربیع الاول سہ شنبہ ۱۳۴۶ھ م ۱۳ ستمبر ۱۹۲۷ء کو نماز ظہر کے بعد ذکر کرتے ہوئے بخار کے مرض میں انتقال ہوا ـــــ نزہۃ الخواطر (تالیف: مولانا سید عبدالحیٔ حسنی لکھنویؒ) کی آٹھویں جلد میں مصنف کے فرزند ارجمند مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مولانا کی بڑی اچھی قلمی تصویر کھینچی ہے ـــــ ''دراز قد، پُر گوشت، گندمی رنگ، سینہ فراخ، کشادہ جبیں، ہمیشہ ہشاش وبشاش، بلند آواز، باوقار و بارعب، نظافت وستھرائی کے دلدادہ، بہت حیاء دار اور ہر ایک کے

ساتھ محبت سے پیش آنے والے'' — حقیقت یہ ہے کہ وہ عالم تھے؛ مگر بلوغ نظر میں اپنے عہد کے علماء سے فائق اور عصری کتابوں سے باخبر، وہ صوفی تھے؛ مگر مشائخ زمانہ سے جدا اور مجاہدانہ حرارتوں سے معمور :

اس کا انداز نظر ، اپنے زمانہ سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

❀ ❀ ❀